حالات وواقعات

ڈاکٹر محمد ریاض محمود*

اقلیتوں سے متعلق مسلمانوں کے فکری تحدیات

[شعبہ علوم اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ۳۰، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء کو ’’معاصر مسلم معاشروں کو درپیش فکری تحدیات‘‘ کے عنوان سے منعقدہ قومی کانفرنس کے لیے لکھا گیا۔]

اسلام روحانی اور مادی اعتبار سے ایسا انسان دوست دین ہے جس میں تمام طبقات کے لئے امن، محبت، ترقی، خوشحالی، رواداری اور احترام کی ہدایات ملتی ہیں۔ (۱) یوں اسلامی فکر وفلسفہ سے وابستہ کسی بھی سیاسی، معاشی یا سماجی نظام میں ظلم، تعصب، جانبداری، حق تلفی یا کسی قسم کے امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی اعلیٰ ظرفی اور شاندار بصیرت کی کرشمہ سازی تھی کہ مختلف ادوار میں قائم ہونے والی مختلف علاقوں کی مسلم حکومتوں نے غیر مسلم اقلیتوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ ان کی سیاسی حیثیت اور نسلی شناخت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں بھرپور کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔ مختلف مذاہب کے حاملین سے عدل اور مساوات کی بنیاد پر معاملات کو طے کیا گیا، مذہبی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے تحمل، ایثار اور بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی راہ ہموار کی گئی، عقائد کے اختلاف کی وجہ سے گالی اور بلا تحقیق الزام تراشی کو ناپسند کیا گیا۔ (۲) حل تنازعات کے لیے مثبت رویے اپنانے کی تعلیم دی گئی۔ (۳) مسلم فکر پر ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی گئی، ان کی تعلیم وتربیت کو ترجیحی بنیادوں پر اہمیت دی گئی، ان کو اپنے مذہبی وسماجی تہوار منانے میں آزادی فراہم کی گئی اور انہیں عبادت گاہیں تعمیر کرنیکی اجازت دی گئی۔ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری اور اُن کے حسن سلوک کی تصدیق وتحسین معروف مستشرقین نے بھی کی ہے۔ سر ولیم میور کے الفاظ کا مفہوم ملاحظہ ہو:

> ’’محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ اُن کے گرجا گھروں اور خانقاہوں کی ہر چیز ویسے ہی برقرار رہے گی۔ کوئی بشپ اپنے عہدہ، کوئی راہب اپنی خانقاہ اور کوئی پادری اپنے منصب سے معزول نہیں کیا جائے گا۔ اُن کے اختیارات وحقوق میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی نیز جبر وتعدی سے کام نہیں لیا جائے گا۔‘‘ (۴)

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، یونیورسٹی آف گجرات، گجرات

معروف ہندو محقق و نقاد شری سندر لال جی کے الفاظ اس طرح ہیں:

> ’’حکمران کی حیثیت سے محمد صاحب نے غیر مسلموں کو یہاں تک کہ بت پرستوں کو بھی اپنی ریاست کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی پوری پوری آزادی بخشی اور اُن کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا۔ لا اکراہ فی الدین مدنی آیت ہے اور محمد صاحب کی پوری زندگی اس آیت کی جیتی جاگتی تصویر ہے‘‘۔ (۵)

ساری اسلامی تاریخ مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے شواہد پر مشتمل ہے خصوصاً برصغیر میں سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کا مذہبی رواداری کو فروغ دینے کے ضمن میں کردار نہایت شاندار اور قابل فخر ہے۔ (۶) یہ مثالی صورتِ حال اُس وقت قائم نہ رہ سکی جب بعض انتہا پسند عناصر نے مذہبی اختلافات کی بنیاد پر تشدد اور توہین آمیز رویوں کو اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ ایسے غیر ذمہ دارانہ اور ناعاقبت اندیش رویوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ جس میں نہ صرف یہ کہ مذہبی اقلیتیں خوف و ہراس کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ مسلمانوں میں موجود بہت سے سنجیدہ حلقے بھی اس پر افسوس، پریشانی، حیرت اور تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ شدت پسندی پر مبنی اس ہلاکت خیز بیان نے مسلم اُمہ کو ابہام اور فکری انتشار سے دوچار کر دیا ہے، اسلامی ریاست کی نوعیت وحیثیت کی تشریح و توضیح پر اختلافات سامنے آئے، (۷) قوم اسلامی ریاست، مسلم ریاست، دینی ریاست، قومی ریاست اور جدید ریاست کی لفظی موشگافیوں میں پھنس کر رہ گئی ہے، (۸) بعض علماء نے اس ضمن میں قدیم فقہی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے، اُنہوں نے دار الاسلام اور دار الحرب کی تقسیم کر کے جدید سیاسی، عالمی اور جغرافیائی حقائق اور اِن کے پس منظر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (۹) جہاد جو ایک مقدس فریضہ ہے اس کی عصری تعبیرات نے قوم کو نظریاتی طور پر پریشانی اور ابہام میں مبتلا کر دیا ہے، اب قوم کا اس معاملے پر متفقہ موقف سامنے آنا محال نظر آ رہا ہے۔ (۱۰)

مسلم ریاستوں کے غیر مسلم باشندگان اہل ذِمہ، اہل صلح، معاہدین اور محاربین کی اصطلاحات کے الجھاؤ میں اپنا وجود تلاش کر رہے ہیں، اُن کی وفاداریوں پر بلاوجہ شک کیا جا رہا ہے، بعض حلقہ یہ تاثر دینے کی کوشش میں ہیں کہ اِن غیر مسلموں کے مغربی طاقتوں سے خفیہ روابط ہیں اور وہ مسلمانوں کے زیر انتظام علاقوں اور ممالک کے خلاف کسی بین الاقوامی منصوبہ بندی اور سازش کا حصہ ہیں۔ بعض طبقات ایک عجیب قسم کی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہیں جس کے مطابق حقیقی دشمن پر قابو نہ پانے کی صورت میں کسی امکانی یا فرضی دشمن کو ہدف بنا کر ذہنی تسکین حاصل کی جاتی ہے، چونکہ دورِ حاضر میں ترقی یافتہ مغربی ممالک کے خلاف کسی قسم کا قدم اُٹھانا مسلم حکومتوں اور تشدد پر یقین رکھنے والے بعض مسلم طبقات کے بس کی بات نہیں، اس لئے وہ اپنے ممالک میں موجود کمزور اور بے بَس اقلیتوں کو ہدف بناتے اور اپنا غصہ نکالتے ہیں۔

ایک مخصوص مذہبی طبقہ اپنے آپ کو برصغیر کے نوآبادیاتی دور میں رواج پانے والی مختلف المذاہب مناظرانہ کشمکش کا

آج بھی حصہ سمجھتا ہے، (۱۱) دیگر مذاہب کے علمی مصادر سے کسی بھی درجے میں اخذ واستفادہ کو نامناسب خیال کیا جاتا ہے۔ توہین رسالت جو کسی بھی مذہب میں ایک ناپسندیدہ اور قابل مذمت فعل ہے (۱۲) خصوصاً مسلمان اس حوالے سے اپنی ایک شاندار اور غیرت مندانہ تاریخ رکھتے ہیں، اس تصور کو ضد، انا اور ناسمجھی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کے فروغ کا واحد ذریعہ تبلیغ، دعوت، حسن اخلاق اور تصوف رہا ہے، مگر آج نوبت یہ آگئی ہے کہ غیر مسلموں کے قبولِ اسلام پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایسی قانون سازی کی جا رہی ہے کہ ایک مخصوص عمر تک کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل نہ کر سکے۔

مذہبی اقلیتیں سیاسی میدان میں اپنی شناخت کو کس طرح قائم رکھیں، اِن کا قانون ساز اداروں میں پہنچنے کا طریقہ کار کیا ہو، ؟ اِن معاملات پر عجیب ابہام پایا جاتا ہے، اقلیتوں کے طریقہ انتخاب میں بار بار تبدیلیاں کی جا رہی ہیں، کبھی وہ براہِ راست اپنے ہم مذہبوں کیے ووٹ لے کر منتخب ہوتے ہیں اور کبھی وہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں کیونکہ اُنہیں بالواسطہ طور پر منتخب ہونا ہوتا ہے، سیاسی جماعتیں اپنے غیر مسلم نمائندوں کی فہرست ترجیحی بنیادوں پر ترتیب دیتی ہیں جن کے مطابق حاصل کردہ کل ووٹوں کے تناسب سے یہ نمائندے اسمبلی کی رکنیت حاصل کرتے ہیں۔ اقلیتوں میں موجود سیاسی بصیرت کے بہت سے حاملین اس سرگرمی کو الیکشن کے بجائے سلیکشن خیال کرتے ہیں۔ (۱۳) یوں اقلیتیں تسلسل کے ساتھ تجربات کی زد میں ہیں، کبھی انہیں ایک ووٹ کا حق دیا جاتا ہے اور کبھی دُہرے ووٹ کا۔ (۱۴) علاوہ ازیں قانون سازی کے مختلف مراحل میں اقلیتوں کو نظر انداز کئے جانے کی شکایات بھی عام ہیں، مذہبی میدان میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ اقلیتوں سے متعلق قانون سازی کرتے وقت مسلمانوں کی رائے کو کس حد تک دخل حاصل ہے اور خود اقلیتوں کی رائے کو کتنی اہمیت دی جائے، آج تک کوئی اصول اور ضابطہ اس ضمن میں طے نہیں کیا جا سکا۔ یہ امر بھی ایک سوالیہ نشان ہے کہ مذہبی اقلیتوں کی مقدس کتب اور اُن کی تاریخ کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے یا اس سے گریز کیا جائے۔

مسلم اُمہ اقلیتوں سے متعلق فکری طور پر دو طبقات میں تقسیم ہے، ایک طبقہ قدامت پسند جب کہ دوسرا روشن خیال ہے۔ مسلمانوں کی یہ داخلی فرقہ بندی کسی ایک مؤقف پر امت مسلمہ کو جمع نہیں ہونے دیتی۔ یہ سوال وضاحت طلب ہے کہ پاکستان میں شریعت اسلامیہ غالب ہے یا ملکی وغیر ملکی قوانین کی پاسداری کی جائے گی۔ علاوہ ازیں اقلیتوں سے متعلق مختلف علمی موضوعات پر گفتگو کے بارے میں بہت سے ذہنی الجھاؤ موجود ہیں مثلاً علمی میدان میں اختلاف کرنے کی حدود کیا ہیں؟ کون کس معاملہ میں کتنا اختلاف کر سکتا ہے اور کیوں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات کے لیے برداشت کی بڑی قوت درکار ہے۔ مسلم امہ فکری اور نظریاتی طور پر اسی نوعیت کے بہت سے سوالات، ابہامات اور علمی پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ مذہبی اقلیتوں کے بارے میں معاملات کو طے کرتے وقت کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔ اسلامی ریاست، جہاد، دہشت گردی، توہین رسالت، قبولِ اسلام کی

حدود و شرائط، حق اختلاف، اقلیتوں کی مذہبی شناخت اور اُن کا حق تبلیغ مذہب، مختلف قومیتوں کا وجود اور استحکام، اقلیتوں کا قانون سازی میں کردار اور مختلف المذاہب طلبہ کے لیے نصابِ تعلیم ایسے معاملات ہیں جن پر درست اور یک سو مسلم فکر کیا ہے اور اس کے تقاضوں کو کس طرح روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ (۱۵) ایسے ہی علمی و فکری اور نظریاتی سوالات کے جوابات تلاش کرنے اور اس ضمن میں درپیش چیلنجز کو سمجھنے اور اُن کی حساسیت کا اندازہ کرنے کے لئے موضوعِ تحقیق کے طور پر ''اقلیتوں سے متعلق مسلمانوں کو درپیش فکری تحدیات'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ذیل میں اُن فکری چیلنجز کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کو اقلیتوں سے متعلق درپیش ہیں۔

۱۔ مذہبی تکثیریت کی اہمیت و حساسیت کا عدم احساس:

تنوع کائنات کا حسن اور قدرت کی تخلیق کا ایک بنیادی اصول ہے، انسانی زندگی میں موجود رنگارنگی کا شعور اور اس کی حکمتوں کی تفہیم خدا شناسی میں معاون ہے۔ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا، انسانوں کے درمیان زبانوں اور رنگوں کے مختلف ہونے کو قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ (۱۶) شکل و صورت اور رنگ و نسل کی انفرادیت کے باعث انسانوں کے درمیان میلانات، جذبات، رجحانات، خیالات اور ترجیحات کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف قدرت الٰہی کا کرشمہ اور ایک اہم معاشرتی ضرورت ہے۔ اس تنوع اور رنگارنگی کی حکمتوں سے واقف ہونا معاشرتی اور مذہبی میدان میں نہایت مفید ہے۔ دنیا میں مختلف المذاہب لوگ رہتے ہیں ان کی مذہبی و نسلی شناخت کا احترام، ان کے حقوق اور ان کی ترجیحات کا علم خوش گوار معاشرت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کثیر العقائد یا مذہبی تکثیریت پر مبنی معاشرے کس طرح بقائے باہمی کے اصولوں کے مطابق ترقی و خوشحالی کی منازل طے کرتے ہیں، اس حقیقت کا ادراک مذہب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ پاکستان مذہبی، نسلی، لسانی، جغرافیائی، معاشی اور سماجی تنوع کا حامل ملک ہے۔ اس تنوع کو ایک فلاحی اور صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھنا تھی، لیکن فہم اور تربیت کے فقدان نے ایسا ممکن نہ ہونے دیا۔ علم و فکر اور شعور و آگہی کے اسی زوال نے پاکستان کو اپنے حقیقی مسائل کے حل سے دور رکھا۔ مذہبی تکثیریت کی نوعیت، اہمیت، فوائد اور محاسن کا عدم شعور ہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جو کسی قوم کو اقلیتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کو قومی دھارے میں شامل کرنے سے روکے رکھتا ہے۔ مختلف المذاہب لوگوں کا باہم مل جل کر رہنا، اعتدال و توازن کے رویوں کو جنم دیتا ہے۔ اور اگر لوگ دیگر افراد معاشرہ کی اہمیت سے ہی آگاہ نہ ہوں تو انواع و اقسام کے تضادات اور عدم برداشت کے رویے پاتے ہیں۔ اس پس منظر میں مذہبی تکثیریت کے مختلف پہلوؤں کا فہم نہایت ضروری ہے۔ کثیر العقائد معاشرے علمی و فکری اعتبار سے بڑے زرخیز واقع ہوتے ہیں۔ اس زرخیزی کا مشاہدہ و تجربہ مسلمانوں نے عباسی اور اُندلسی ادوارِ حکومت میں خوب کیا، ان مثالی ادوار میں مسلم – غیر مسلم تعلقات اس حد تک خوشگوار تھے کہ اعلیٰ ترین سطح کی تعلیم و تحقیق کیلئے قائم کئے گئے اداروں کی سربراہی کئی مرتبہ غیر مسلم ماہرین علم و فن کو سونپی گئی۔ دورِ جدید میں مسلم معاشروں کو یہ چیلنج درپیش ہے کہ مذہبی و ثقافتی تنوع کی اہمیت کا احساس

رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تنوع ایک قوت ہے، اسے دبانے کے بجائے قبولیت سے نوازا جائے اور دوسروں کو جگہ بنانے کا موقع فراہم کیا جائے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق سے متعلق احساسِ ذمہ داری کا فقدان:

مذہبی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے اقلیتوں کا وجود کسی بھی ملک کیلئے ایک اہم اور حساس معاملہ ہے۔ کسی بھی ملک کی آزادی، ترقی اور استحکام کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ اس میں بسنے والی اقلیتیں، کتنی مطمئن اور خوشحال ہیں، انہیں کس حد تک قومی دھارے میں شامل کیا گیا ہے (۱۷)، ان کے تعلیمی ادارے کتنے بااختیار اور مؤثر ہیں، ریاست کے ساتھ اُن کی وابستگی کی گہرائی کتنی ہے اور اُن کے حقوق کی ادائیگی کیلئے اکثریتی آبادی کیا نقطہ نظر رکھتی ہے؟ نیز اس نقطہ نظر کا عملی اظہار اُن میں کس درجے تک پایا جاتا ہے؟ یہ تمام سوالات ساری پاکستانی قوم سے تقاضا کرتے ہیں کہ اقلیتوں سے متعلق نہایت مثبت اور حوصلہ افزا رویہ رکھا جائے لیکن مقامِ افسوس ہے کہ اس ضمن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا بلکہ احساسِ ذمہ داری کے فقدان نے منصوبہ سازوں کی منفی کارکردگی سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم آج تک بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ۱۱/۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی اُس تقریر کی مبہم تشریحات میں پھنسے ہوئے ہیں جس میں اُنہوں نے پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ اُن کے مذہبی وسیاسی حقوق پوری طرح محفوظ ہوں گے اور ریاست پاکستان اس ضمن میں کوئی جانب دارانہ رویہ اختیار نہیں کرے گی۔ (۱۸) اس پس منظر میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اقلیتوں کے وجود کو دلی طور پر نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا جائے بلکہ اُن کی خوشحالی وترقی کیلئے شعوری کوششیں کی جائیں۔

۳۔ اسلامی ریاست اور اقلیتوں کی حیثیت کے بارے میں ابہامات:

فکری میدان میں مسلم امہ کو آج جن چیلنجز کا سامنا ہے اُن میں اسلامی ریاست کا وجود اور اُس کی نوعیت وتشکیل بڑے نمایاں ہیں۔ آج تک یہ بحث جاری ہے کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے، مسلم ریاست ہے، قومی ریاست ہے، اسلامی جمہوریہ ہے یا دارالاسلام ہے۔ (۱۹) اسی طرح اس ملک میں رہنے والے غیر مسلم فقہ اسلامی کی رُو سے کس حیثیت اور درجے کے مالک ہیں، اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی بحث اس ضمن میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے، (۲۰) علاوہ ازیں معاہدین، اہل ذِمہ، اہل صلح اور محاربین ایسی فقہی اصطلاحات کی مدد سے اُن کی قانونی حیثیت کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (۲۱) علم وفکر اور فہم ودانش کے میدان میں یہ عجیب وغریب الجھاؤ قوم کو اقلیتوں کے بارے میں یک رُخ ہونے سے روکے رکھتے ہیں۔

۴۔ جہاد سے متعلق نامناسب تعبیرات وتاویلات:

جہاد کی حیثیت اور اس کے مقاصد وطریقہ ہائے کار کو اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے، یہ وہ بنیادی سوال ہے جو اہل

مغرب مسلمانوں سے تکرار کیساتھ کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے جہاد سے متعلق مختلف الجہات تشریحات منظرعام پر آچکی ہیں۔ ان تعبیرات وتشریحات نے علمی دنیا کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے لیے کام کرنیوالی تنظیموں کو بھی ایک عجیب اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ عصر حاضر میں ''جہاد'' ایک حساس موضوع قرار پایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی وسعت وقبولیت کا سہرا دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ جہادی سرگرمیوں کے سر ہے۔ اس مخصوص تاریخی ونظریاتی پس منظر میں جہاد نہ صرف یہ کہ اجروثواب کے حصول کا باعث ہے بلکہ اقوام عالم کیساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کا تعین بھی کرتا ہے۔ مخمصہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں تصورِ جہاد کی مختلف تعبیرات سامنے آئی ہیں۔ ایک حلقہ اسے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا فریضہ سمجھتے ہوئے کفار کو دعوت اسلام کی جانب راغب کرتا ہے اور کفار اس دعوت کو قبول نہ کریں تو اُن کے خلاف جہادی سرگرمیوں کا آغاز کر کے اُنہیں اپنا زیرنگیں بنالینا چاہتا ہے۔ ایک دوسرا حلقہ جہاد کو محض مسلمانوں کے دفاع اور غیرمسلموں کے ظلم کے خاتمے کی ایک تدبیر قرار دیتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اس تصور کو پوری دنیا پر اسلام کی سیاسی حاکمیت قائم کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ (۲۲) ان کی رائے میں اسلام شخصی اعتقاد میں تو کفروشرک کو گوارا کرتا ہے، لیکن کسی ایسے نظامِ حکومت کا وجود اسے قبول نہیں جس میں خدائی قانون کے علاوہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کیا گیا ہو۔ (۲۳)

مولانا امین احسن اصلاحی کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ باطل نظام کے انتشار کو بھی اُس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جولوگ اس باطل نظام کو درہم برہم کررہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظامِ حق بھی قائم کرسکیں گے۔ انارکی اور بےنظمی کی حالت ایک غیرفطری حالت ہے بلکہ انسانی فطرت سے اس قدر پیچیدہ کہ تعمیر انسانیت کے لیے زہر قاتل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو، جس کی اطاعت ووفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی قائم نظام کو تو درہم برہم کرسکتے ہوں، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت اُنہوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کرسکتے ہیں۔ (۲۴)

یعنی وہ جہاد وقتال کے عمل کو اتنی زیادہ پابندیوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں کہ جن کا اہتمام کرنا، فی نفسہ ایک پیچیدہ اور حساس معاملہ ہے۔ ان مختلف تعبیرات نے جہاد کے نام پر کام کرنے والی مختلف تنظیموں کو جہاد کے نت نئے مفاہیم اور اسالیب اختیار کرنے کی گنجائش فراہم کردی ہے۔ یہ غیرمحدود گنجائش اقلیتوں سے متعلق مسلم طرزِ فکر کو بعض اوقات منفی طور پر متاثر کرتی ہے۔ مسلم ممالک میں بعض مسلمان تنظیموں کی طرف سے اقلیتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے نامناسب سلوک کو اسی پس منظر میں سمجھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ قانون توہین رسالت کے استعمال پر اقلیتوں کے تحفظات:

مقدس ہستیوں، مقدس کتب خصوصاً انبیاء ورُسل سے متعلق نازیبا کلمات وانداز کسی بھی معاشرے میں برداشت

نہیں کئے جاتے مگر پاکستان میں ایک مخصوص قانون نے اس ساری صورتِ حال کو اقلیتوں سے وابستہ کر دیا ہے۔ اقلیتیں اس قانون کے حوالے سے شدید عدم تحفظ کا شکار ہیں، اس قانون سازی کا پس منظر یہ ہے کہ برصغیر کی انگریز حکومت نے اس ضمن میں کچھ اقدامات کئے۔ کسی مذہب کی عبادت گاہ کو نقصان پہنچانا یا اس کے تقدس کو کسی بھی طریقے سے پامال کرنا، 1860ء کے قانون کی دفعہ 295 کے تحت قابلِ تعزیر جرم قرار پایا، قیامِ پاکستان کے بعد اسی قانون میں کئی ترامیم کی گئیں۔ ان ترامیم میں مذہبی شعائر، قرآن مجید اور انبیاء ورسل کی توہین پر بھی سزاؤں کا اعلان کیا گیا۔ نظریاتی پس منظر اپنی جگہ پر، عمل کے میدان میں اس قانون کا شکار اقلیتیں ہی ہوتی آئی ہیں۔ اس حقیقت کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جن پر توہین مذہب یا توہین رسالت کا الزام لگتا ہے، اُن پر عدالت میں جا کر جرم ثابت کرنے کے بجائے حملے کئے جاتے ہیں اور انہیں ماورائے عدالت قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس پرتشدد اور خوفناک ماحول کے پیشِ نظر جج اور وکلاء ایسے مقدمات کی سماعت اور کاروائی کو آگے بڑھانے سے قصداً گریز کرتے ہیں۔ اس قتل وغارت میں ملوث انتہاپسند ذہنیت رکھنے والے لوگ کسی قانونی کاروائی سے محفوظ رہتے ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کا تاثر یہ ہے کہ اصولی ونظریاتی طور پر اگر یہ قانون درست بھی ہے تو اس کے عمل درآمد میں بہت سی ناانصافیاں موجود ہیں۔ (۲۵) اِن حالات میں عدالتیں دباؤ میں کام پر مجبور ہیں اور ذرائع ابلاغ اپنی غیر جانب داریت کو قائم رکھنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس خطرناک اور گمبھیر صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ کسی بھی مہذب معاشرے میں بلاتحقیق وتفتیش کسی شخص کو کسی جرم کا مرتکب قرار دینا، قطعاً ظلم اور ناقابل برداشت فعل ہے۔ اس رویے کی تائید وحمایت مسلم تاریخ ومصادر سے بھی نہیں ہوتی ہے۔ اقلیتوں سے متعلق اس فکری چیلنج کو سمجھے اور اس پر مناسب فیصلہ سازی کئے بغیر امن، خوشحالی اور فراہمی انصاف کے کسی دعوے کی تصدیق وتائید نہیں ہوسکتی۔

۶۔ تبدیلی مذہب سے متعلق حالیہ قانون سازی:

اقلیتوں کی طرف سے یہ شکایات اکثر موصول ہوئی ہیں کہ اُن کی لڑکیوں کو زبردستی مسلمان بنا کر شادیاں کر لی جاتی ہیں، نیز اُن کے نابالغ بچوں کے مذہب بھی تبدیل کئے جاتے ہیں۔ (۲۶) اگر یہ سب کچھ درست ہے تو نہایت قابل افسوس ہے، اس ظالمانہ اور غیر اسلامی روش کا سدباب مسلم اُمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اسی پس منظر میں گزشتہ دنوں سندھ اسمبلی نے اقلیتوں کے حقوق کے عنوان سے ایک بل منظور کیا ہے جس کے مطابق کسی غیر مسلم کے اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے اسلام لانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس بل کی منظوری حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش ہے اور یہ ساری کاروائی عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ امر مسلمہ ہے کہ اسلام میں کسی کو زبردستی مسلمان بنانا قطعاً جائز نہیں اور ایسی کسی کوشش کو روکنا بھی درست ہے جس میں کسی شخص پر تبدیلی مذہب کے لیے دباؤ ڈالا جائے، لیکن دوسری طرف اپنی مرضی سے اسلام لانے پر پابندی لگا کر کسی کو دوسرے مذہب پر باقی رہنے

کے لئے مجبور کرنا بھی بدترین زیادتی ہے۔ اگر کوئی نابالغ بچہ مسلمان ہونا چاہے تو اُسے روکنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قابل اعتراض قانون کو منسوخ کیا جائے، البتہ اگر تبدیلی مذہب کے لیے کسی زبردستی یا جبر کا ارتکاب کیا جائے تو اس کے مرتکب افراد یا اداروں کے خلاف موثر کاروائی ضرور کی جائے۔

۷۔ آئینی تضادات:

اقلیتوں کے حقوق اور اُن کے سماجی رُتبہ کا براہ راست تعلق آئین اور قانون سے ہے۔ بہت سے ایسے قانونی اور سماجی معاملات ہیں جن کے بارے میں آئین میں تضادات ہیں۔ آئین ایک طرف شریعت کی پاسداری کی ضمانت دیتا ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی اداروں کے بیان کردہ انسانی حقوق کی ادائیگی کا یقین دلاتا ہے۔ دلچسپ اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شریعت کے کئی امور ایسے ہیں جو کہ مختلف اداروں کے بیان کردہ انسانی حقوق سے مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نظریاتی واصولی طور پر ایسی چیزیں طے کرلیں کہ کہاں شریعت پر عمل ہوگا اور کہاں بین الاقوامی قوانین پر۔ یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ موجودہ بین الاقوامی قانون کی حیثیت کیا ہے، کیونکہ تمام مسلم ممالک نے مختلف بین الاقوامی معاہدات کو تسلیم کررکھا ہے اور انہوں نے بین الاقوامی عرف کی پابندی کی یقین دہانی کرارکھی ہے۔ اس پس منظر میں بین اقوامی معاملات میں چند اصولوں کو قانونی طور پر مسلمات کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، (۲۷) یوں جب تک معاصر بین الاقوامی قانون کی حجیت یا عدمِ حجیت کا فیصلہ نہ کرلیا جائے، اُس وقت تک اقلیتوں کے بارے میں واضح حکمت عملی کا تعین کرنا ایک نہایت مشکل معاملہ ہے۔

۸۔ دورِ جدید کے مسلمات سے عدم واقفیت:

اقلیتوں سے متعلق عدم برداشت کے رویوں کے بہت سے نفسیاتی وجذباتی اسباب بھی ہیں، بعض لوگ جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تحقیق وتنقید کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی دینی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔ وہ ایسے قدیم لٹریچر کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں جو کہ دورِ جدید میں اپنی حیثیت گنوا چکا ہے۔ زمانے کے تغیرات نے مسلمات کو بدل کررکھ دیا ہے، اس علمی وفکری اور سماجی ارتقاء کو سمجھے بغیر معاملات دنیا کی تفہیم ناممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم آج تک مذہبی اقلیتوں کے بارے میں ذمی، معاہد، اہل صلح، محارب اور مفتوح ایسی مخصوص فقہی اصطلاحات کے معانی ومفاہیم کے تعین میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اقلیتوں سے متعلق غور وفکر کرتے ہوئے ہمیں تغیر پذیر عالمی حالات کی نوعیت وحساسیت کو سمجھنا ہوگا۔ عالمی اداروں اوران کے چارٹرز کو نظر انداز کرکے ہمیں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں، اُن پر بھی نظر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۹۔ اقلیتوں سے متعلق امور میں غیر تحقیقی رویے:

اقلیتوں کے لیے مسائل پیدا کرنے میں اکثریتی آبادی کے جذباتی اور غیر تحقیقی رویوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

مذہبی اشتعال پیدا کرنے والے اکثر واقعات کی تحقیق وتفتیش جب بھی کی گئی تو معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ وہ نہیں جس کا شہرہ تھا۔ توہین رسالت اور قرآن مجید کو نذرِ آتش کرنے کے بہت سے واقعات کی حقیقت یہ ہے کہ ان کے پس منظر میں ذاتی انتقام، غصہ اور تعصب کارفرما تھا۔ (۲۸) اقلیتوں سے متعلق امور میں غیر تحقیقی رویوں کو اختیار کرنا ایک ایسا مذہبی وسماجی مسئلہ ہے جس کے اثرات پاکستان مسلسل بھگت رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بحیثیت قوم تمام معاشرتی طبقات کو عدل، مساوات اور تحقیق کا پابند کیا جائے۔

۱۰۔ علمی مکالمات کا فقدان:

قومی وبین الاقوامی مسائل کے حل میں علمی مکالمہ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، مذہبی اقلیتوں کے مسائل کیا ہیں؟ ان کے اسباب ومحرکات کیا ہیں؟ مذہبی اقلیتوں کے مسائل حل کرنے میں کون سے عوامل وعناصر موثر ہو سکتے ہیں؟ اس ضمن میں مذہب ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ایک موثر علمی مکالمہ ہی فراہم کرسکتا ہے۔ کیونکہ مکالمہ دوطرفہ عمل ہے جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ مکالمہ سے گریز، ضد، اشتعال اور غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ مکالمے کی عدم موجودگی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ افراد واقوام نے اپنے تمام مسائل حل کر لئے ہیں یا پھر یہ کہ تمام طبقات کی علمی صلاحیتیں کمزور پڑ گئی ہیں۔ اس علمی کمزوری کا فائدہ مخصوص مفاداتی طبقات اٹھاتے ہیں۔ یہ طبقات تشدد اور عدم برداشت کی راہ ہموار کرتے ہیں اور معاشرے میں شکست وریخت کا باعث بنتے ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کے وجود، ان کے تشخص اور اُن کے سیاسی ومذہبی حقوق پر بات چیت سے گریز کرنا، پاکستانی مسلمانوں کیلئے ایک اہم نفسیاتی اور فکری چیلنج ہے۔ علمائے کرام، اہل دانش، پالیسی ساز شخصیات اور عام لوگوں کو اس چیلنج کی حساسیت کا احساس کرتے ہوئے اقلیتوں کے سماجی، علمی، سیاسی اور مذہبی معاملات میں گنجائش اور وسعت کا پہلو تلاش کرنا ہوگا جو کہ مؤثر مکالمہ کے بغیر ممکن نہیں۔

۱۱۔ اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرنے کے رجحانات:

اقلیتوں سے عدم رواداری کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے دائرہ اختیار سے لاعلم ہیں، وہ ہر چیز کو انفرادی اور ذاتی حیثیت میں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس کوشش میں وہ ناکام ہو جائیں تو انتہائی اقدام کرنے سے گریز نہیں کرتے، اس بات کی فکر کم ہی ہوتی ہے کہ یہ عمل یا ردعمل میرے دائرہ اختیار میں بھی ہے یا نہیں۔ توہین رسالت اور قرآنی اوراق جلانے کے ردعمل میں جتنے واقعات رپورٹ ہوئے ہیں، اُن میں کبھی کسی نے یہ نہیں خیال کیا کہ ان واقعات پر ردعمل دینا اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے نیز وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس عمل کا جواب دہ نہیں ہے۔ اگر عدالتی نظام کو مضبوط بنایا جائے اور اس نظام پر اعتماد کیا جائے تو ریاست ایسے واقعات سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتی ہے۔ ریاستی نظام کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود کسی فرد کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے اور کسی قسم کی مذہبی اشتعال انگیزی کا باعث بنے۔

۱۲۔ اختلافِ رائے کے اصول و آداب کی عدمِ تفہیم:

مختلف معاملات میں افرادِ معاشرہ کا مختلف نقطہ ہائے نظر کا حامل ہونا ایک فطری امر ہے۔ تمام لوگوں کی علمی وفکری اور ذہنی وجسمانی صلاحیتیں ایک جیسی نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کی معلومات، مشاہدات اور تجربات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر اختلافِ رائے کے اظہار کے لیے مناسب مواقع فراہم نہ کئے جائیں تو یہ اختلاف اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جس کے منفی اور برے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ اختلافِ رائے کا مقصد بلاوجہ اپنی رائے پر اصرار نہیں ہے بلکہ دستیاب وسائل کی روشنی میں ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر اپنی رائے خوبصورت انداز میں دوسرے کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اگر دوسروں کے پاس بہتر ثبوت اور دلائل موجود ہوں تو ان کو سنا جائے اور انہیں اپنی رائے پر قائم رہنے کا حق دیا جائے۔ اختلافِ رائے کے اصول و آداب کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اختلافِ رائے کی صورت میں تحقیقی رویوں کو فروغ دیا جائے، مخالف اور اس کی رائے کا احترام کیا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ غلطی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان اصول و آداب کو سمجھنا اور انہیں استعمال کرنا کثیر المذاہب معاشروں کے افراد کیلئے بہت ضروری ہے۔ مسلم امہ کا ایک المیہ عہد حاضر میں یہ ہے کہ اختلافِ رائے کے معنی ومفہوم پر توجہ نہیں دی جاتی نیز اس کے آداب و شرائط کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ رجحان مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی ادائیگی اور اس ضمن میں مناسب ذہن سازی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

۱۳۔ متوازن نصابِ تعلیم:

تعلیمی نصاب کسی قوم کی نظریاتی اساس کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے، اسے متوازن ومعتدل اور مختلف معاشرتی طبقات کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہونا چاہئے۔ نصاب میں کسی مذہب کی توہین ایک نامناسب بات ہے، اکثریتی آبادی کے مذہبی فلسفہ کو ہی اگر نصاب قرار پانا ہے تو متحدہ ہندوستان میں ''بندے ماترم'' کے گیت پر مسلمانوں نے جو احتجاج کیا تھا، اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ ہندو اکثریت میں تھے، مسلمانوں نیا کثریت کیاس طرزِ عمل کو کیوں قبول نہیں کیا تھا؟ یقیناً اس سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ ہر طالب علم کا حق ہے کہ اسے برابری کے اصول پر تعلیم وتربیت کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ جو عقائد وافکار اس کے مذہب سے مناسبت نہ رکھیں، اُسے اُنہیں پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ ہمارا فکری تضاد ہوگا کہ ہم غیر مسلم بچوں کو اسلام پڑھنے کا پابند کریں اور جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں دیگر مذاہب کی تدریس پر احتجاج کریں اور ناراضگی کا اظہار کریں۔ معقولیت اسی میں ہے کہ اکثریت اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے سے گریز کرے۔

۱۴۔ تنازعات کے خاتمے میں غیر سنجیدگی کا مظاہرہ:

ایک ہی ماحول ومعاشرہ میں مختلف العقائد لوگوں کی موجودگی سے کسی نہ کسی تنازعہ یا تناؤ کا پیدا ہو جانا فطری امر

ہے لیکن اربابِ فکر و دانش افراد اور اقوام کے درمیان تنازعات کو سنجیدگی کے ساتھ ختم کرنے کے لیے پرعزم ہوں تو معاشرہ مذہبی ہم آہنگی کی بہترین تصویر پیش کرسکتا ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ مختلف اوقات میں پیش آنے والے نامناسب سلوک کے نتیجے میں جو تنازعات سامنے آیا ان کے حل کرنے میں بہت زیادہ سنجیدگی دیکھنے میں نہیں آئی۔ قومی سطح پر اس احساس کی بیداری اشد ضروری ہے کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی مذہبی اختلاف اشتعال کی شکل اختیار کرنے لگے تو فوراً ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے ماحول پرامن منزل کی طرف بڑھ سکے۔ حل تنازعات کے ضمن میں اختیار کی جانیوالی غیر سنجیدگی کی روش اقلیتوں سے متعلق امور میں مایوسی کی فضا کو پیدا کرتی ہے۔ زندہ اور بیدار مغز قوم کی حیثیت سے ہمیں اقلیتوں سے متعلق تنازعات کو حل کرنے کیلئے مستقل بنیادوں پر منصوبہ بندی کرنا ہوگی کیونکہ ان تنازعات پر عدمِ توجہ کے نتیجے میں معاشرہ تشدد، ضد، خوف، احساسِ کمتری اور اجتماعیت سے دوری ایسے منفی رجحانات کا شکار ہو رہا ہے۔ تنازعات کا علم جدید سماجی علوم میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے (۲۹)، اس شعبہ علم سے بھرپور استفادہ عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے۔

اقلیتوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اُنہیں حقوق عطا کرنے کے ضمن میں مسلم اُمہ کو عصر جدید میں جن چیلنجز کا سامنا ہے، اُن کا مناسب اور شریعت اسلامیہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے حل تلاش کرنا ازحد ضروری ہے۔ مسلم اُمہ کو درپیش فکری چیلنجز کی تفہیم کو یقینی بنانے کے لیے دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اقدامات کیے جائیں۔ ان اداروں میں تحقیقی مقالات، سیمینارز، کانفرنسوں اور کلاس روم لیکچرز کے ذریعے اقلیتوں سے متعلق شعور کو بیدار کیا جائے۔ نیز سماجی و سیاسی ڈھانچے کو معتدل و متوازن بنانے کے لئے ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھا جائے۔ اس ضمن میں نہایت ضروری ہے کہ نصابِ تعلیم میں اقلیتوں اور مذہبی تکثیریت سے متعلق مختلف مباحث کو شامل کیا جائے، اس ضمن میں مختلف مذاہب کی تعلیمات سے مدد لی جائے اور ان کے نمائندوں کو مختلف نصابی کمیٹیوں میں نمائندگی دی جائے۔ اقلیتوں سے متعلق شعور کی بیداری میں ذرائع ابلاغ کو بھی استعمال کیا جائے۔ علاوہ ازیں اختلاف اور تنقید کی اخلاقیات کی پابندی کو ہر طبقہ فکر میں رواج دیا جائے۔ مذہبی اشتعال انگیزی کو ریاستی اداروں کے ذریعے کنٹرول کیا جائے اور اس ضمن میں کسی بھی طبقہ کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ اقلیتوں سے متعلق معاملات میں عدل، احتیاط اور تحقیق سے کام لیا جائے، نیز کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ پاکستان میں اقلیتوں کی حیثیت اور اُن کے حقوق کی ادائیگی سے متعلق عالمی سطح پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ اسلام کے سیاسی نظام کی وضاحت میں اعتدال و توازن سے کام لیا جائے۔

اسلامی ریاست، اقلیتوں، جہاد اور توہین رسالت ایسے حساس موضوعات پر غیر ذمہ دارانہ تبصرہ سے گریز کیا جائے۔ پاکستان میں موجود مذہبی اقلیتوں کو اہل مغرب کا ہم خیال اور ہم نوا سمجھنے کے بجائے محبِّ وطن شہری تصور کیا جائے، اگر کسی معاملے میں کوئی تنازعہ سامنے آئے تو اختلافِ رائے کے اصول و آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے نیز اُس

مسئلہ کو حل کرنے کی غیر جانبدارانہ اور موثر کوششیں کی جائیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام میں مذہبی رواداری، دارالشعور، ۳۷-مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱تا۱۷

۲۔ الانعام۶:۸۰۱

۳۔ النحل۵۲۱:۶۱

4.WilliamMuir,TheLifeof Mahomet,SmithElder&Company,London,1958, P:158

۵۔ شری سندر لال جی، آنحضرت کی زندگی، ششماہی وشال، کلکتہ، بھارت، نومبر۱۹۳۳ء، ص: ۵۱۴

۶۔ ملاحظہ ہو: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہدِ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۰۹ء، مجلدات: ۳

۷۔ سید محمد میاں، پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت، ماہنامہ برہان، دہلی، جون ۱۹۵۰ء، مشمولہ، برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت از ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، قاری منزل، پاکستان چوک، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص: ۹۱۱ تا ۳۲۱، نیز ملاحظہ ہو: مجتبیٰ محمد راٹھور، جہاد، جنگ اور دہشت گردی، نیریٹوز پرائیویٹ لمیٹڈ، پوسٹ بکس نمبر: ۲۱۱۰، اسلام آباد، جون ۲۰۱۲ء، ص: ۹۰ تا ۹۱

۸۔ ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت، ص: ۹۳ تا ۹۷

۹۔ محمد مشتاق احمد، جہاد، مزاحمت اور بغاوت، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، جون ۲۰۱۲ء، ص: ۸۳ تا ۱۴۸

۱۰۔ محمد شہباز منج، ڈاکٹر، مباح الدم اور ''جہادیوں'' کا بیانیہ، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص: ۳۰ تا ۳۵

۱۱۔ ڈاکٹر محمد ریاض محمود (راقم)، برصغیر میں مسلم-مسیحی مناظرانہ ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء): تحقیقی وتنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی علومِ اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، سیشن: ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء، ص: ۹۲ تا ۱۰۵

۱۲۔ سیف الحق چکیسری، اسلام کا تصورِ جہاد اور القاعدہ، شعیب سنز، مینگورہ، سوات، ۲۰۱۰ء، ص: ۵۶۵ تا ۵۷۲

۱۳۔ طارق کرسٹوفر قیصر، کتابچہ: صُلحِ کُل، سلسلہ: ۲۱ فلیٹ نمبر: ۸، آر بی-۱، عوامی کمپلیکس، گارڈن ٹاؤن، لاہور، ص: ۱-۲

۱۴۔ نذیر ناجی، اب دھاندلی نہیں ہوگی، روزنامہ نوائے یوقت، اسلام آباد، ۴ مارچ ۱۹۹۶ء، مشمولہ پاکستان کی پہچان: جے سالک، اہل بصیرت کی نظر میں، تدوین، جبار مرزا، شہریار پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر: ۱۶۹۲، جی پی او، اسلام آباد، ۷ مئی ۲۰۰۶ء، ص: ۲۰۶

۱۵۔ خورشید ندیم، صدارتی خطبہ، سماجی ہم آہنگی، رواداری اور تعلیم: پاکستان کی جامعات کے اساتذہ کے ساتھ نشستوں کی روداد، مرتبین: سجاد اظہر، احمد اعجاز، پاکستان انسٹی ٹوٹ فار پیس سٹڈیز، جولائی ۲۰۱۶ء، ص: ۴۵ تا ۴۸، نیز ملاحظہ ہو: شہزاد اقبال شام، ڈاکٹر، دساتیر پاکستان کی اسلامی دفعات-ایک تجزیاتی مطالعہ، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام، آباد،

۲۰۱۱ء، ص: ۲۹۱ تا ۲۲۲

۱۷۔ الروم ۲۲: ۳۰

۱۷۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، فکشن ہاؤس، ۱۳ مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۱ تا ۵۱

۱۸۔ محمد عمار خان ناصر، بین المذاہب مکالمہ کی ایک نشست کے سوال وجواب، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جلد: ۲۷، شمارہ: ۱، جنوری ۲۰۱۶ء، ص: ۲۵

۱۹۔ جاوید احمد غامدی، ریاست اور حکومت، ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد: ۲۷، شمارہ: ۴، اپریل ۲۰۱۵ء، ص: ۱۷ تا ۲۰، نیز ملاحظہ ہو: محمد عمار خان ناصر، ریاست، معاشرہ اور مذہبی طبقات، ماہنامہ الشریعۃ، گوجرانوالہ، جلد: ۲۴، شمارہ: ۳، مارچ ۲۳۱۰ء، ص: ۱۸ تا ۲۳

۲۰۔ ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت، ص: ۹۹ تا ۱۰۳

۲۱۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، اسلام کا قانون بین الممالک، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۱۷ تا ۳۱۳، نیز ملاحظہ ہو: محمد عمار خان ناصر، بین المذاہب مکالمہ کی ایک نشست کے سوال وجواب، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جلد: ۲۷، شمارہ: ۱، جنوری ۲۰۱۶ء، ص: ۲۲ تا ۲۵

۲۲۔ سیف الحق چکیسری، اسلام کا تصورِ جہاد اور القاعدہ، ص: ۱۱۳ تا ۱۱۴

۲۳۔ محمد عمار خان ناصر، جہاد: ایک مطالعہ، المورد، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱ تا ۱۰

۲۴۔ سیف الحق چکیسری، اسلام کا تصورِ جہاد اور القاعدہ، ص: ۱۱۵ تا ۱۱۹

۲۵۔ رازشتہ سیتھنا، پاکستان میں اقلیتوں کی حالت زار، سہ ماہی تجزیات، اسلام آباد، شمارہ: ۳۷، اپریل– جون ۲۰۱۵ء، ص: ۹۰-۹۱

۲۶۔ روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۶ نومبر ۲۰۱۵ء، پاکستانی سینٹ کی فنکشنل کمیٹی برائے انسانی حقوق کا اجلاس، ص: ۱، ۵

۲۷۔ محمد مشتاق احمد، جہاد، مزاحمت اور بغاوت، ص: ۱۴۹ تا ۱۷۵

۲۸۔ اداریہ، ماہنامہ ہم سخن انٹرنیشنل، لاہور، جولائی ۲۰۱۳ء، جلد: ۱۷، شمارہ: ۵، ص: ۴ تا ۵

۲۹۔ محمد حسین، حل تنازعات کے طریقے سیرتِ نبوی کی روشنی میں، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جلد: ۲۷، شمارہ: ۳، مارچ ۲۰۱۶ء، ص: ۲۲ تا ۲۷